ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 1955

Program: BS Islamic Studies (Spec. Qur'an & Tafsir)

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: سورۃ النساء اور سورہ المائدہ کا موضوعاتی مطالعہ (1955)

سطح: بی ایس علوم اسلامیہ (تخصص قرآن و تفسیر)

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق: 1 (یونٹ نمبر: 1 تا 5)

کل نمبر: 100 کامیابی کا نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ و حوالہ کے لیے)

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کی کتاب کی متعلقہ اکائیوں کا اچھی طرح مطالعہ کریں، مفاہیم کو سمجھیں اور پھر اسائنمنٹ اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔ قرآنی آیات کے مفاہیم کی مزید تصدیق کے لیے مستند تفاسیر سے بھی رجوع کریں۔

سوال نمبر 1: سورۃ النساء کی آیات 19 تا 21 میں ذکر کردہ عہدِ نکاح کی اہمیت اور بیوی کو دیے ہوئے مال کو واپس لینے کے احکامات پر مفصل نوٹ لکھیے۔ (20 نمبر)

سوال نمبر 1: سورۃ النساء کی آیات 19 تا 21 میں ذکر کردہ عہدِ نکاح کی اہمیت اور بیوی کو دیے ہوئے مال کو واپس لینے کے احکامات پر مفصل نوٹ لکھیے۔

تعارف

سورۃ النساء قرآن مجید کی وہ عظیم سورت ہے جس میں خاندانی زندگی، عورتوں، یتیموں اور معاشرے کے کمزور طبقات کے حقوق کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اس سورت کی آیات 19 تا 21 میں نکاح کے بندھن کی تقدیس، عورت کے ساتھ حسنِ سلوک اور اسے دیے گئے مال، خصوصاً حق مہر کو واپس لینے کی ممانعت کا بیان ہے۔ دورِ جاہلیت میں عورت کو وراثت کی ایک شے سمجھا جاتا تھا؛ شوہر کے مرنے کے بعد اس کے رشتہ دار بیوہ کو زبردستی اپنے قبضے میں لے لیتے یا اسے دوسری جگہ شادی کرنے سے روک کر اس سے مال بٹورتے تھے۔ اسی طرح بعض شوہر بیوی کو تنگ کر کے اسے اس بات پر مجبور کر دیتے تھے کہ وہ اپنا مہر چھوڑ دے یا طلاق کے بدلے مال دے۔ قرآن مجید نے ان آیات میں ان تمام رسموں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور نکاح کو ایک پختہ، مقدس اور ذمہ داریوں سے بھرپور عہد قرار دیا۔ زیرِ نظر جواب میں پہلے عہدِ نکاح کی اہمیت بیان کی جائے گی، پھر بیوی کو دیا ہوا مال واپس لینے کے احکامات کی تفصیل پیش کی جائے گی اور آخر میں ان احکامات کی حکمتوں اور آج کے معاشرے کے لیے ان کی رہنمائی کا جائزہ لیا جائے گا۔

آیات کا مفہوم اور پس منظر

آیت نمبر 19 میں ارشاد ہے کہ اے ایمان والو! تمہارے لیے حلال نہیں کہ تم زبردستی عورتوں کے وارث بن جاؤ، اور انہیں اس لیے نہ روکو کہ تم نے جو کچھ انہیں دیا ہے اس کا کچھ حصہ لے لو، الّا یہ کہ وہ کھلی بے حیائی کا ارتکاب کریں، اور ان کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی بسر کرو؛ پھر اگر تم انہیں ناپسند کرو تو ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت بھلائی رکھ دے۔ آیت نمبر 20 میں فرمایا گیا کہ اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانا چاہو اور ان میں سے کسی کو خزانے کے برابر مال بھی دے چکے ہو تو اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو؛ کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح گناہ کر کے لو گے؟ آیت نمبر 21 اس ممانعت کی وجہ بیان کرتی ہے کہ تم وہ مال کیسے واپس لے سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے سے مل چکے ہو اور وہ تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔ ان تینوں آیات میں دراصل ایک مکمل خاندانی اخلاقیات پیش کی گئی ہے جس کی بنیاد عدل، رحمت، وفاداری اور عہد کی پاسداری ہے۔

عہدِ نکاح کی اہمیت

آیت نمبر 21 میں نکاح کے لیے "میثاقاً غلیظاً" یعنی پختہ اور بھاری عہد کی تعبیر استعمال کی گئی ہے۔ یہی تعبیر قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے انبیاء سے لیے گئے عہد اور بنی اسرائیل سے لیے گئے عہد کے لیے بھی آئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکاح محض ایک دنیاوی معاہدہ یا وقتی سمجھوتا نہیں بلکہ ایک مقدس دینی عہد ہے جس کی گواہی اور نگرانی اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے۔ اس عہد کی

اہمیت کا پہلا پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے دو اجنبی انسان ایک دوسرے کے لیے حلال، محرمِ راز اور زندگی کے ساتھی بن جاتے ہیں اور ایک نئے خاندان کی بنیاد پڑتی ہے جس سے نسلِ انسانی کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس عہد کے ساتھ دونوں فریقوں پر حقوق و فرائض کی ایک مکمل ذمہ داری عائد ہو جاتی ہے: شوہر پر نفقہ، رہائش، تحفظ اور حسنِ سلوک لازم آتا ہے اور بیوی پر اطاعتِ معروف، امانت اور گھر کی نگرانی کی ذمہ داری آتی ہے۔

عہدِ نکاح کی اہمیت کا تیسرا پہلو اس کا نفسیاتی اور اخلاقی اثر ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا اور اسے نصف دین سے تعبیر کیا، کیونکہ یہ انسان کو بے راہ روی سے بچاتا، نگاہ اور شرمگاہ کی حفاظت کا ذریعہ بنتا اور سکونِ قلب عطا کرتا ہے؛ قرآن مجید نے سورۃ الروم میں اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت رکھ دی۔ چوتھا پہلو یہ ہے کہ عہدِ نکاح عورت کی عزت و وقار کی ضمانت ہے: جاہلیت میں عورت کو مالِ وراثت کی طرح منتقل ہونے والی شے سمجھا جاتا تھا، مگر اسلام نے اسے عہد کی فریق اور حقوق کی حامل شخصیت قرار دیا۔ اسی لیے فقہاء لکھتے ہیں کہ نکاح کے عہد کو توڑنا، بلاوجہ طلاق دینا یا بیوی کو معلق چھوڑ دینا اس بھاری عہد کی خلاف ورزی ہے جس کا حساب آخرت میں لیا جائے گا، اور اسی اہمیت کی بنا پر شریعت نے طلاق کو حلال چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ عمل قرار دیا ہے۔

بیوی کو دیا ہوا مال واپس لینے کی ممانعت

ان آیات کا دوسرا بڑا حکم یہ ہے کہ شوہر نے بیوی کو جو مال دیا ہو، خواہ وہ حقِ مہر ہو، تحفہ ہو یا کوئی اور عطیہ، طلاق یا علیحدگی کے وقت اسے واپس لینا جائز نہیں۔ آیت نمبر 20 نے اس حکم کو نہایت زور دار انداز میں بیان کیا ہے کہ اگر شوہر نے بیوی کو "قنطاراً" یعنی خزانے بھر مال بھی دیا ہو تو اس میں سے کچھ بھی نہ لے۔ لفظِ قنطار مبالغے کے لیے ہے، یعنی مال کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو، دیے ہوئے مال پر دوبارہ قبضے کا حق پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ مہر بیوی کا خالص حق ہے جو نکاح کے عوض میں اس کی ملکیت میں آ چکا ہے؛ سورۃ النساء ہی کی آیت نمبر 4 میں حکم دیا گیا ہے کہ عورتوں کو ان کے مہر خوش دلی سے ادا کرو اور صرف وہی حصہ حلال ہے جو وہ اپنی خوشی اور رضامندی سے معاف کر دیں۔ چنانچہ زبردستی، دباؤ یا تنگ کر کے مہر معاف کروانا یا واپس لینا اسی طرح حرام ہے جس طرح کسی اور کا مال ناحق کھانا حرام ہے۔

آیت نمبر 19 میں اس ممانعت کی ایک خاص صورت یہ بیان کی گئی ہے کہ بیوی کو اس لیے روکنا اور تنگ کرنا کہ وہ اپنا دیا ہوا مال چھوڑ کر خلاصی حاصل کرے، "عضل" کہلاتا ہے اور یہ صریحاً ممنوع ہے۔ البتہ آیت میں ایک استثنا بھی ذکر ہے کہ اگر عورت کھلی بے حیائی یعنی صریح بدکاری یا حد درجہ نافرمانی کا ارتکاب کرے تو اس صورت میں فقہاء و مفسرین کے نزدیک معاملہ مختلف ہو سکتا ہے اور عدالت یا باہمی رضامندی سے مسئلے کا حل نکالا جا سکتا ہے؛ تاہم اس استثنا کو عام حالات میں مال بٹورنے کا بہانہ بنانا کسی طرح جائز نہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی واضح رہے کہ خلع کی

صورت میں جب علیحدگی کی خواہش عورت کی طرف سے ہو اور کوئی ظلم شوہر کی طرف سے نہ ہو تو باہمی اتفاق سے طے شدہ معاوضہ اس ممانعت میں داخل نہیں، کیونکہ وہ معاملہ ایک نئے باہمی معاہدے کی حیثیت رکھتا ہے؛ مگر شوہر کے لیے مناسب نہیں کہ وہ دیے گئے مہر سے زیادہ طلب کرے۔ ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ ممانعت کا اصل مقصد عورت کو معاشی استحصال سے بچانا اور طلاق جیسے ناخوشگوار مرحلے کو بھی عدل و احسان کے دائرے میں رکھنا ہے۔

ناپسندیدگی کے باوجود حسنِ سلوک کا حکم

آیت نمبر 19 کے آخری حصے میں ایک نہایت لطیف اخلاقی رہنمائی دی گئی ہے کہ بیوی کے ساتھ اچھے طریقے سے زندگی گزارو، اور اگر کسی وجہ سے وہ تمہیں ناپسند ہو تو صبر کرو، کیونکہ ممکن ہے کہ جسے تم ناپسند کرتے ہو اللہ نے اس میں تمہارے لیے بہت سی بھلائی رکھ دی ہو۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ ناپسندیدگی بسا اوقات عارضی، یک طرفہ یا کسی ظاہری سبب کی بنا پر ہوتی ہے، جبکہ بیوی کی دینداری، وفاداری، اولاد کی تربیت اور مشکل وقت کی رفاقت ایسی نعمتیں ہیں جو بعد میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس حکم نے گھریلو زندگی کو جذبات کی فوری لہروں کے بجائے عقل، صبر اور دور اندیشی پر استوار کیا اور یہ اصول دیا کہ رشتے کا فیصلہ وقتی ناراضی سے نہیں بلکہ مجموعی بھلائی دیکھ کر کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے طلاق سے پہلے سمجھانے، ناراضی کا اظہار محدود رکھنے، دونوں خاندانوں سے ثالث مقرر کرنے اور پھر رجوع کی گنجائش رکھنے کے مراحل مقرر کیے، تاکہ عہدِ نکاح حتی الامکان قائم رہے۔

ان احکامات کی حکمتیں اور معاصر اہمیت

ان آیات کی حکمتوں کا جائزہ لیا جائے تو سب سے بڑی حکمت عورت کے معاشی تحفظ کی ضمانت ہے: مہر اور دیے گئے مال کو ناقابلِ واپسی قرار دے کر عورت کو طلاق کی صورت میں بے سہارا ہونے سے بچایا گیا اور مرد کو یہ سوچنے پر مجبور کیا گیا کہ طلاق کا فیصلہ ہلکا پھلکا کھیل نہیں۔ دوسری حکمت خاندانی نظام کا استحکام ہے کہ جب مال واپس لینے کا لالچ ختم ہو جائے تو بہت سی طلاقیں محض مالی مفاد کی خاطر وقوع پذیر ہونے سے رک جاتی ہیں۔ تیسری حکمت عہد شکنی کی حوصلہ شکنی ہے کہ جو شخص اللہ کو گواہ بنا کر کیا گیا عہد توڑتے وقت بھی لوٹ مار کرے گا وہ معاشرے کے کسی عہد کا پاسدار نہیں رہ سکتا۔ آج کے دور میں جب مہر واپس لینے، جہیز کے مطالبات اور طلاق کے بعد مالی ہراسانی کے واقعات عام ہیں، ان آیات کی رہنمائی پہلے سے زیادہ اہم ہو گئی ہے؛ مسلم معاشرے کو چاہیے کہ نکاح کو سادگی سے، مہر کو حقیقی حق سمجھ کر اور اختلاف کو ثالثی اور انصاف سے حل کرنے کا ماحول پیدا کرے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیات 19 تا 21 نے نکاح کو "میثاقِ غلیظ" قرار دے کر اسے زندگی کے مقدس ترین عہدوں میں شامل کر دیا، عورت کو وراثت کی شے بننے سے نجات دی، اس کے ساتھ معروف طریقے سے زندگی گزارنے کا حکم دیا اور بیوی کو دیے گئے مال، خصوصاً مہر، کو واپس لینے کو بہتان اور صریح گناہ قرار دے کر ہمیشہ کے لیے ممنوع کر دیا۔ یہ احکامات عورت کے وقار، خاندان کے استحکام اور معاشرے کے عدل و رحمت پر مبنی نظام کی بنیاد ہیں، اور ان پر عمل ہی سے وہ گھرانہ وجود میں آتا ہے جسے قرآن نے سکون، محبت اور رحمت کا گہوارہ قرار دیا ہے۔

سوال نمبر2: اولوالامر سے کیا مراد ہے؟ اولوالامر کی امتیازی خصوصیات اور اسلامی نظامِ حکومت کے بنیادی اصول تحریر کیجیے۔ (20 نمبر)

سوال نمبر2: اولوالامر سے کیا مراد ہے؟ اولوالامر کی امتیازی خصوصیات اور اسلامی نظامِ حکومت کے بنیادی اصول تحریر کیجیے۔

تعارف

اسلام ایک جامع نظامِ حیات ہے جو عبادت و اخلاق کے ساتھ ساتھ سیاست و حکومت کے بارے میں بھی مکمل رہنمائی دیتا ہے۔ اسلامی نظامِ حکومت کی بنیادی آیت سورۃ النساء کی آیت نمبر 59 ہے جس میں ارشاد ہوا کہ اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے اولوالامر کی بھی، پھر اگر کسی معاملے میں تمہارا اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ اسی آیت سے "اولوالامر" کی اصطلاح اسلامی سیاسی فکر کی مرکزی اصطلاح بنی اور اسی کے گرد حکمرانوں کے انتخاب، ان کی صفات، ان کی اطاعت کی حدود اور نظامِ حکومت کے اصولوں کی پوری عمارت کھڑی ہوئی۔ زیرِ نظر جواب میں پہلے اولوالامر کا مفہوم اور مفسرین کی آراء بیان کی جائیں گی، پھر ان کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے گا اور آخر میں اسلامی نظامِ حکومت کے بنیادی اصول تفصیل سے پیش کیے جائیں گے۔

اولوالامر کا مفہوم

لفظِ "اولو" کے معنی ہیں والے یا صاحب، اور "امر" کے معنی ہیں حکم، معاملہ اور اختیار؛ چنانچہ اولوالامر سے مراد وہ لوگ ہیں جن کے ہاتھ میں امورِ مملکت و ملت کا اختیار اور فیصلے کی ذمہ داری ہو۔ مفسرین کے ہاں اس کی تفسیر میں چند آراء ملتی ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور کئی جلیل القدر مفسرین کے نزدیک اس سے مراد علماء و فقہاء ہیں جو شریعت کے احکام بیان کرتے اور عوام کی دینی رہنمائی کرتے ہیں؛ ایک دوسری جماعت کے نزدیک اس سے مراد امراء و حکام ہیں جو انتظامی اور سیاسی اختیارات کے مالک ہوتے ہیں؛ اور لشکر کے سرداروں کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے کہ زمانۂ نبوی میں جہاد کے امیر کو اطاعت کا مرکز مانا جاتا تھا۔ جامع اور راجح [illegible] یہ ہے کہ اولوالامر ایک جامع اصطلاح ہے جس میں سیاسی حکمران، انتظامی ذمہ داران، علماء و اہلِ حل و عقد اور وہ تمام اشخاص شامل ہیں جنہیں اجتماعی امور میں فیصلے کا اختیار حاصل ہو، بشرطیکہ وہ خود مسلمان ہوں، کیونکہ آیت میں "منکم" یعنی تم میں سے، کی قید اس امر کی طرف واضح اشارہ ہے کہ اسلامی ریاست کا حکمران اور ذمہ دار مسلمانوں ہی میں سے ہو گا۔

اطاعتِ اولوالامر کی حدود

اولوالامر کی اطاعت کو قرآن نے اللہ اور رسول کی اطاعت کے تابع رکھا ہے، یہ کوئی آزاد اور مطلق اطاعت نہیں۔ آیت کی ساخت خود یہ بتا رہی ہے کہ اصل اطاعت اللہ کی ہے، رسول کی اطاعت اسی کی اطاعت کا مظہر ہے، جبکہ اولوالامر کی اطاعت ان دونوں کے بعد اور ان کے ماتحت درجے پر ہے۔ اسی لیے اگر اولوالامر اور اللہ و رسول کے حکم میں ٹکراؤ ہو، یا خود مسلمانوں اور حکمران کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو فیصلہ کن مرجع قرآن و سنت قرار دیا گیا ہے۔ احادیث میں یہ حد اور واضح کر دی گئی ہے کہ اطاعت صرف معروف یعنی نیکی اور جائز امور میں ہے، اللہ کی نافرمانی والے کام میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں، اور جو حکمران اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرے اور عدل قائم کرے اس کی بات سننا اور ماننا واجب ہے۔ اس متوازن اصول نے ایک طرف انتشار و بغاوت سے بچا کر نظام کی بقا کی ضمانت دی اور دوسری طرف حکمران کو مطلق العنان بننے سے روک دیا، کیونکہ اس کی اطاعت شریعت کی پابندی سے مشروط کر دی گئی۔

اولوالامر کی امتیازی خصوصیات

اولوالامر کی سب سے پہلی امتیازی خصوصیت ایمان اور اسلام ہے، کیونکہ "منکم" کی قید کا یہی تقاضا ہے کہ اقتدار کی باگ ڈور اسی کے ہاتھ میں ہو جو خود اللہ اور رسول پر ایمان رکھتا ہو اور نظام کو اسلامی اصولوں پر چلانے کا پابند ہو۔ دوسری خصوصیت علم و بصیرت ہے: حکمران اور اس کے مشیر اس قدر علمی اور فکری اہلیت رکھتے ہوں کہ قرآن و سنت سے مسائل کا حل اخذ کر سکیں یا

اہلِ علم سے رجوع کر کے درست فیصلے تک پہنچ سکیں؛ جاہل اور نااہل شخص کی سربراہی خود قرآن کے اس اصول کے خلاف ہے کہ امانتیں اہل لوگوں کے سپرد کی جائیں، جیسا کہ اسی سورت کی آیت نمبر 58 میں حکم دیا گیا ہے۔ تیسری خصوصیت عدل و انصاف ہے: اولوالامر اپنی رعایا کے درمیان بلاامتیازِ مذہب، نسل، خاندان اور طبقہ انصاف قائم کرنے کا ذمہ دار ہے اور یہی اس کے اقتدار کا اصل جواز ہے۔ چوتھی خصوصیت امانت و دیانت ہے کہ اقتدار کو ذاتی مفاد، خاندانی عروج یا مال و دولت سمیٹنے کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ اسے اللہ کی امانت سمجھ کر استعمال کرے۔

اولوالامر کی پانچویں خصوصیت شوریٰ پسندی اور عوامی مشاورت ہے کہ وہ اہم فیصلے تنہا اپنی رائے سے نہ کرے بلکہ اہلِ حل و عقد اور ماہرین سے مشورہ کرے، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ وحی کے باوجود صحابہ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ چھٹی خصوصیت تقویٰ اور آخرت کی جوابدہی کا احساس ہے؛ حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں پوچھا جائے گا، یہی احساس حکمران کو ظلم، خود غرضی اور غرور سے بچاتا ہے۔ ساتویں خصوصیت قوتِ فیصلہ، شجاعت اور انتظامی صلاحیت ہے تاکہ وہ فتنے کے وقت مضبوط موقف اختیار کر سکے، سرحدوں اور امنِ عامہ کی حفاظت کر سکے اور کمزوری و تذبذب سے قوم کو نقصان نہ پہنچائے۔ آٹھویں خصوصیت رعایا کی خیر خواہی اور خدمت کا جذبہ ہے؛ حدیث کے مطابق جو شخص مسلمانوں کے کسی معاملے کا والی بنے پھر ان کے لیے محنت اور خیر خواہی نہ کرے وہ ان کے ساتھ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ یہ خصوصیات مل کر اسلامی حکمران کی وہ مثالی تصویر بناتی ہیں جو مغربی مطلق حکمران اور محض انتخابی سیاست دان دونوں سے ممتاز ہے۔

اسلامی نظامِ حکومت کے بنیادی اصول

اسلامی نظامِ حکومت کا پہلا اصول حاکمیتِ الٰہی ہے، یعنی اصل حاکم و آمر اللہ تعالیٰ ہے اور انسان اس کی زمین پر اس کا خلیفہ اور نائب ہے؛ حکمران قانون ساز نہیں بلکہ الٰہی قانون کا نافذ کنندہ ہے، اس لیے اسلامی ریاست میں کوئی شخص یا ادارہ قرآن و سنت کے خلاف قانون نہیں بنا سکتا۔ دوسرا اصول خلافت و امانت کا تصور ہے جس کے تحت اقتدار ذاتی ملکیت یا وراثت نہیں بلکہ ایک امانت ہے جو اہل لوگوں کے سپرد کی جاتی ہے اور جس کا حساب دنیا میں عوام اور آخرت میں اللہ کے سامنے دینا ہوتا ہے۔ تیسرا اصول شوریٰ ہے: سورۂ شوریٰ میں مؤمنوں کی صفت بیان کی گئی کہ ان کا معاملہ آپس کے مشورے سے طے پاتا ہے اور سورۂ آل عمران میں رسول اللہ ﷺ کو مشورے کا حکم دیا گیا؛ چنانچہ قانون سازی، پالیسی اور اہم قومی فیصلے مشاورت سے ہونا اس نظام کی روح ہے۔ چوتھا اصول عدلِ اجتماعی ہے کہ ریاست کا سب سے بڑا فریضہ ہر شخص کو بلا تفریق انصاف پہنچانا ہے، حتیٰ کہ قرآن نے عدل کو تقویٰ کے قریب ترین عمل قرار دیا ہے۔

پانچواں اصول قانون کی بالادستی اور مساوات ہے کہ اسلامی ریاست میں حکمران اور محکوم، امیر اور غریب سب ایک ہی قانون کے پابند ہیں؛ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، یہ اعلان قانون کی غیر جانبدارانہ عملداری کی ابدی مثال ہے۔ چھٹا اصول اہلیت کی بنیاد پر تقرری ہے کہ مناصب رشتہ داری، سفارش یا دولت

کی بنیاد پر نہیں بلکہ علم، امانت اور صلاحیت کی بنیاد پر دیے جائیں۔ ساتواں اصول امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ادارہ جاتی نظام ہے جس کے ذریعے ریاست نیکی کی ترویج اور برائی کی روک تھام کی ذمہ دار بنتی ہے۔ آٹھواں اصول عوامی فلاح و کفالت ہے کہ ریاست یتیموں، مسکینوں، بیواؤں اور بے سہارا لوگوں کی بنیادی ضروریات کی کفیل ہے اور بیت المال اسی مقصد کے لیے قائم ہوتا ہے۔ نواں اصول احتساب ہے کہ حکمران بھی جوابدہ ہے؛ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے پہلے خطبے میں فرمایا تھا کہ میں تم پر اس وقت تک والی ہوں جب تک اللہ اور رسول کی اطاعت کروں، اگر نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر لازم نہیں۔ دسواں اصول بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ ہے جن میں جان، مال، عزت، عقیدہ اور آزادیِ رائے کا تحفظ شامل ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ اولوالامر سے مراد مسلمانوں کے وہ حکام، علماء اور ذمہ داران ہیں جن کے ہاتھ میں اجتماعی امور کا اختیار ہو، ان کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کے تابع اور معروف کے دائرے میں مشروط ہے، اور ان کی امتیازی خصوصیات ایمان، علم، عدل، امانت، شوریٰ پسندی اور خدمتِ خلق ہیں۔ اسلامی نظامِ حکومت حاکمیتِ الٰہی، خلافت و امانت، شوریٰ، عدل، قانون کی بالادستی، احتساب اور عوامی فلاح جیسے اصولوں پر قائم ہے۔ یہ نظام نہ بادشاہت ہے نہ بے لگام جمہوریت، بلکہ ایک ایسا متوازن نظام ہے جس میں حکمران طاقتور بھی ہے اور جوابدہ بھی، اور رعایا فرمانبردار بھی ہے اور حق گو بھی۔

سوال نمبر 3: سورۃ النساء کی آیات 64 تا 70 میں بیان کردہ رسول اللہ ﷺ کی امتیازی خصائص تحریر کیجیے۔ (20 نمبر)

سوال نمبر 3: سورۃ النساء کی آیات 64 تا 70 میں بیان کردہ رسول اللہ ﷺ کی امتیازی خصائص تحریر کیجیے۔

تعارف

سورۃ النساء کی آیات 64 تا 70 رسول اللہ ﷺ کے مقام و مرتبے، آپ کی اطاعت کی فرضیت اور آپ سے تعلق کے آداب کو بیان کرنے والی نہایت اہم آیات ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ ہر رسول اسی لیے بھیجا گیا کہ اللہ کے اذن سے اس کی اطاعت کی جائے، گناہ گاروں کے لیے آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر استغفار کرنا اور آپ کا ان کے لیے استغفار کرنا قبولیت کا ذریعہ ہے، ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک آپ کو ہر اختلاف میں حکم نہ مانا جائے اور آپ کے فیصلے کو خوش دلی سے تسلیم نہ کیا جائے، اور اطاعتِ رسول کا صلہ یہ ہے

کہ انسان کو آخرت میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت نصیب ہو گی۔ زیرِ نظر جواب میں ان آیات کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی امتیازی خصائص کو منظم انداز میں پیش کیا جائے گا اور ہر خصوصیت کے عقیدتی و عملی پہلوؤں کی وضاحت کی جائے گی۔

خصوصیت نمبر 1: آپ ﷺ کی اطاعت اللہ کے اذن سے فرض ہے

آیت نمبر 64 کا آغاز اس قاعدۂ کلیہ سے ہوتا ہے کہ ہم نے جو بھی رسول بھیجا، اسے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول کی اطاعت کوئی اختیاری یا اضافی عمل نہیں بلکہ رسالت کا مقصدِ اصلی ہے، کیونکہ وحی کا عملی نمونہ اور تشریح رسول ہی کے ذریعے امت تک پہنچتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی اس خصوصیت کا امتیاز یہ ہے کہ آپ خاتم النبیین ہیں، آپ کی اطاعت قیامت تک ہر امتی پر فرض ہے اور آپ کی اطاعت کو خود اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت قرار دیا ہے؛ اسی مضمون کو اسی سورت کی آیت نمبر 80 میں یوں بیان کیا گیا کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اس خصوصیت کا عملی نتیجہ یہ ہے کہ عبادات، معاملات، اخلاق اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبے میں سنتِ رسول ہی معیار ہے، اور دین میں کوئی ایسی راہ قابلِ قبول نہیں جو آپ کی ہدایت سے ہٹ کر اختیار کی جائے۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ "باذن اللہ" کی قید کا مفہوم یہ ہے کہ اطاعتِ رسول کی توفیق اور اس کا وقوع اللہ کے اذن و مشیت سے ہے، مگر شرعاً اس کا حکم قطعی اور اس کی خلاف ورزی گمراہی ہے۔

خصوصیت نمبر 2: آپ ﷺ کی بارگاہ استغفار و شفاعت کا وسیلہ ہے

آیت نمبر 64 کے دوسرے حصے میں ارشاد ہے کہ اگر یہ لوگ، جب انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، آپ کے پاس آ جاتے، پھر اللہ سے بخشش مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے بخشش مانگتا تو وہ اللہ کو بہت توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان پاتے۔ اس آیت سے رسول اللہ ﷺ کی ایک عظیم امتیازی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کی دعا اور استغفار امت کے لیے اللہ کی رحمت کے نزول کا خاص ذریعہ ہے۔ حیاتِ طیبہ میں صحابہ کرام اپنے گناہوں، کوتاہیوں اور مشکلات میں آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دعا کی درخواست کیا کرتے تھے اور آپ کی دعا سے انہیں سکون و مغفرت کی بشارت ملتی تھی۔ علماء نے اس آیت کی روشنی میں یہ اصول اخذ کیا ہے کہ نیک اور مقبول بندوں سے دعا کروانا اور ان کے وسیلے سے اللہ کی رحمت طلب کرنا جائز و مشروع ہے، جبکہ حقیقی مغفرت فرمانے والا صرف اللہ ہے۔ اس خصوصیت میں امت کے لیے یہ سبق بھی ہے کہ گناہ کے بعد مایوسی کے بجائے توبہ کا راستہ کھلا ہے، اور توبہ کی قبولیت کے لیے رسول کی سنت سے وابستگی اور آپ کی شفاعت کی امید اس راستے کی روشنی ہے، کیونکہ قیامت کے دن بھی آپ ﷺ ہی شفاعتِ کبریٰ کے مقامِ محمود پر فائز ہوں گے۔

خصوصیت نمبر 3: آپ ﷺ حکم و فیصل ہیں اور آپ کا فیصلہ تسلیم کرنا ایمان کی شرط ہے

آیت نمبر 65 میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ربوبیت کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا کہ یہ لوگ اس وقت تک مؤمن نہیں ہو سکتے جب تک آپ کو اپنے باہمی اختلافات میں حکم نہ بنالیں، پھر آپ جو فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اسے پوری طرح تسلیم کر لیں۔ قسم کے ساتھ یہ انداز اس خصوصیت کی غیر معمولی اہمیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس آیت نے رسول اللہ ﷺ کو زندگی کے تمام تنازعات میں آخری فیصلہ کن مرجع قرار دیا اور ایمان کی کسوٹی تین درجات پر رکھی: پہلا یہ کہ اختلاف کی صورت میں رجوع آپ ہی کی طرف ہو، دوسرا یہ کہ آپ کے فیصلے پر دل میں کوئی کدورت اور تنگی باقی نہ رہے، اور تیسرا یہ کہ اسے عملاً پوری فرمانبرداری سے تسلیم کیا جائے۔ حیاتِ نبوی کے بعد یہی درجہ آپ کی سنت و شریعت کو حاصل ہے، چنانچہ قرآن و سنت کے واضح حکم کے مقابلے میں ذاتی رائے، رسم و رواج یا خواہشِ نفس کو ترجیح دینا اس آیت کے منافی ہے۔ مفسرین اس آیت کو اصولِ فقہ کی بنیادی آیات میں شمار کرتے ہیں، کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شارع کی حیثیت اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہے اور مومن کا کمال اسی میں ہے کہ وہ فیصلۂ شریعت کو دل و جان سے قبول کرے۔

خصوصیت نمبر 4: آپ ﷺ کی اطاعت میں ہر آزمائش پر صبر اور اس کا عظیم اجر

آیات نمبر 66 اور 67 میں ارشاد ہے کہ اگر ہم ان پر یہ بات فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے بہت تھوڑے لوگ اس پر عمل کرتے، حالانکہ جو نصیحت انہیں کی جاتی ہے اگر وہ اس پر عمل کرتے تو یہ ان کے لیے بہتر اور ایمان کو زیادہ مضبوط کرنے والا ہوتا، اور اس صورت میں ہم انہیں اپنی طرف سے بہت بڑا اجر عطا فرماتے اور سیدھے راستے کی ہدایت دیتے۔ یہ آیات بعض منافقین کے اس رویے کے پس منظر میں نازل ہوئیں جو آسان احکام پر تو عمل کر لیتے تھے مگر مشکل فیصلے کی گھڑی میں رسول کے حکم سے کتراتے تھے۔ اس سے آپ ﷺ کی یہ خصوصیت ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کی اطاعت محض آسان امور میں نہیں بلکہ جان و مال اور گھر بار کی قربانی کے مواقع پر بھی لازم ہے، اور یہی اطاعت ایمان کی پختگی کا معیار ہے۔ صحابہ کرام کی زندگی اس کی روشن مثال ہے کہ انہوں نے ہجرت، جہاد اور مالی قربانی کے ہر مرحلے پر رسول کے اشارے کو اپنی جان سے مقدم رکھا اور نتیجہ میں دنیا و آخرت کی سرخروئی پائی۔

خصوصیت نمبر5: آپ ﷺ کی رفاقت کا ذریعہ اور صالحین کی معیت کا وعدہ

آیات نمبر 69 اور 70 میں اطاعتِ خدا اور رسول کا شاندار صلہ بیان ہوا ہے کہ جو اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا، یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین، اور یہ لوگ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں؛ یہ اللہ کا فضل ہے اور اللہ کافی ہے سب کچھ جاننے والا۔ ایک صحابی نے جب یہ تشویش ظاہر کی کہ جنت میں آپ ﷺ کا درجہ بلند ہو گا اور ہم آپ کی زیارت سے محروم رہیں گے تو انہیں یہ بشارت سنائی گئی کہ المرء مع من احب، آدمی اسی کے ساتھ ہو گا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔ اس سے آپ ﷺ کی امتیازی خصوصیت یہ ظاہر ہوتی ہے کہ آپ کی اطاعت و محبت انسان کو بلند ترین روحانی رفاقتوں تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ دنیا میں آپ کی پیروی کرنے والا آخرت میں آپ کی معیت سے نوازا جائے گا۔ یہ مقام و خصوصیت کسی اور رہنما کو حاصل نہیں کہ اس کی پیروی پر انبیاء و صدیقین کی صحبت کا وعدہ کیا گیا ہو اور یہی وجہ ہے کہ امت کے صالحین نے ہمیشہ اتباعِ سنت کو اپنی زندگی کا مرکز رکھا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیات 64 تا 70 رسول اللہ ﷺ کی پانچ امتیازی خصائص کو نمایاں کرتی ہیں: آپ کی اطاعت اللہ کے اذن سے فرض ہے، آپ کی بارگاہ اور دعا مغفرت و رحمت کا وسیلہ ہے، آپ تمام اختلافات میں حکم ہیں اور آپ کے فیصلے کو دل سے تسلیم کرنا ایمان کی شرط ہے، آپ کی اطاعت مشکل ترین آزمائشوں میں بھی لازم ہے اور اسی اطاعت پر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت کا وعدہ ہے۔ یہ خصائص دراصل عقیدۂ رسالت کی بنیاد ہیں اور مومن کی زندگی کا لائحہ عمل یہی ہے کہ وہ محبت، اطاعت اور تسلیم کامل کے ساتھ سنتِ رسول سے وابستہ رہے۔

سوال نمبر4: سورۃ النساء آیات 88 تا 91 میں ہجرت کے احکامات اور ہجرت کی مختلف صورتوں کی وضاحت کیجیے۔ (20 نمبر)

سوال نمبر4: سورۃ النساء آیات 88 تا 91 میں ہجرت کے احکامات اور ہجرت کی مختلف صورتوں کی وضاحت کیجیے۔

تعارف

ہجرت اسلامی تاریخ اور اسلامی شریعت کا ایک بنیادی تصور ہے۔ نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت نے اسلامی معاشرے اور ریاست کی بنیاد رکھی اور اسی نسبت سے اسلامی تقویم کا آغاز بھی ہجرت ہی سے ہوا۔ سورۃ النساء کی آیات 88 تا 91 میں ہجرت کے حوالے سے ایک خاص تاریخی پس منظر میں اہم احکامات بیان ہوئے ہیں: یہ آیات ان منافقین اور متذبذب لوگوں کے بارے میں ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے مگر مکہ میں کفار کے درمیان مقیم تھے اور انہوں نے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی تھی۔ مسلمانوں کے درمیان ان کے بارے میں دو آراء پائی جاتی تھیں، کچھ نرمی کے قائل تھے اور کچھ سختی کے؛ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں واضح اصول عطا فرمایا کہ ولاء و تعلق کی بنیاد ہجرت اور عملی وابستگی ہے، البتہ چند صورتوں کو استثنا بھی قرار دیا۔ زیرِ نظر جواب میں پہلے آیات کا مفہوم و پس منظر، پھر ہجرت کے احکامات اور آخر میں ہجرت کی مختلف صورتوں کی تفصیل بیان کی جائے گی۔

آیات کا مفہوم اور پس منظر

آیت نمبر 88 میں فرمایا گیا کہ تمہیں کیا ہوا ہے کہ منافقین کے بارے میں تم دو گروہ ہو گئے ہو، حالانکہ اللہ نے انہیں ان کے اعمال کی وجہ سے اوندھا کر دیا ہے؛ کیا تم اسے ہدایت دینا چاہتے ہو جسے اللہ نے گمراہ کر دیا ہو۔ آیت نمبر 89 میں حکم دیا گیا کہ ان میں سے کسی کو دوست نہ بناؤ جب تک وہ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کر لیں۔ پھر اگر وہ منہ پھیر لیں تو انہیں پکڑو اور قتل کرو جہاں پاؤ، اور ان میں سے کسی کو نہ ساتھی بناؤ نہ مددگار۔ آیت نمبر 90 میں دو گروہوں کو مستثنیٰ قرار دیا گیا: ایک وہ لوگ جو ایسی قوم سے جا ملیں جن کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو، اور دوسرے وہ جو تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ ان کے سینے اس بات سے تنگ ہوں کہ وہ تم سے لڑیں یا اپنی قوم سے لڑیں؛ ایسے لوگ اگر تم سے الگ رہیں، لڑائی نہ کریں اور صلح کی پیش کش کریں تو اللہ نے تمہیں ان کے خلاف کوئی راہ نہیں دی۔ آیت نمبر 91 میں ایک تیسرے گروہ کا ذکر ہے جو دونوں طرف سے امن چاہتا ہے، یعنی مسلمانوں سے بھی اور اپنی قوم سے بھی، مگر جب بھی فتنے کی طرف بلایا جاتا ہے تو اس میں کود پڑتا ہے؛ ایسے لوگ اگر الگ نہ رہیں، صلح کی پیش کش نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو ان کے بارے میں سخت رویے کی اجازت دی گئی ہے۔

ہجرت کے احکامات

ان آیات سے ہجرت کے جو احکامات اخذ ہوتے ہیں ان میں پہلا حکم یہ ہے کہ جب کسی سرزمین پر دین پر عمل کرنا ناممکن ہو جائے، اذان و نماز اور شعائرِ اسلام کی ادائیگی روک دی جائے اور ایمان و جان کا تحفظ مشکل ہو جائے تو وہاں سے دارِ امن کی طرف ہجرت کرنا فرض ہو جاتا ہے؛ خود اسی سورت کی آیات 97 تا 99 میں ان لوگوں کو ملامت کی گئی ہے جو ہجرت کی قدرت کے

باوجود ظالموں کے درمیان پڑے رہے، الّا یہ کہ وہ واقعی مستضعف اور بے بس ہوں۔ دوسرا حکم یہ ہے کہ سماجی و سیاسی تعلق اور دوستی کی بنیاد محض زبانی دعوے نہیں بلکہ عملی ہجرت و وابستگی ہے؛ جو شخص دشمن کے دار میں رہ کر مسلمانوں کی مدد سے عملی طور پر کٹا ہوا ہو، اسے اپنا ولی و مددگار نہ بنایا جائے۔ تیسرا حکم معاہدے کی پاسداری ہے کہ جس قوم سے مسلمانوں کا معاہدہ ہو، ان سے جا ملنے والوں کے خلاف بھی کارروائی نہیں کی جائے گی، خواہ وہ خود ہجرت نہ کر چکے ہوں، کیونکہ عہد کی پابندی اسلام کا بنیادی اخلاقی اصول ہے۔ چوتھا حکم یہ ہے کہ جو فریق لڑائی سے الگ رہے اور صلح کی پیش کش کرے اس کے خلاف جنگ جائز نہیں، کیونکہ اسلام کا مقصد فساد برپا کرنا نہیں بلکہ امن کا قیام ہے۔ پانچواں حکم یہ ہے کہ دوغلی اور منافقانہ روش اختیار کرنے والوں سے ہوشیار رہا جائے اور ان کی فتنہ انگیزی کو روکا جائے۔

جدول: آیات 88 تا 91 میں منافقوں کے گروہ اور ان کے احکامات

گروہ	خصوصیت	حکم
ہجرت سے انکار کرنے والے منافقین	مسلمان ہونے کا دعویٰ مگر کفار کے دار میں مقیم اور عملاً دشمن کے ساتھی	انہیں دوست و مددگار نہ بنایا جائے؛ عداوت پر اتر آئیں تو مقابلہ کیا جائے
معاہدہ والی قوم سے ملنے والے	ایسی قوم سے وابستہ ہیں جن سے مسلمانوں کا صلح کا معاہدہ ہے	معاہدے کی پاسداری؛ ان کے خلاف کارروائی نہیں
غیر جانبدار اور صلح جو	نہ مسلمانوں سے لڑنا چاہتے ہیں نہ اپنی قوم سے؛ صلح کی پیش کش کرتے ہیں	ان کے خلاف کوئی راہ نہیں؛ صلح قبول کی جائے
دوغلے فتنہ پرور	دونوں طرف سے امن کے دعوے دار مگر ہر فتنے میں شریک	باز نہ آئیں تو ان کی فتنہ انگیزی روکی جائے

ہجرت کی مختلف صورتیں

ہجرت کی پہلی اور مشہور صورت ہجرتِ مکانی ہے، یعنی دین وایمان کی حفاظت کے لیے ایک جگہ چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہونا۔ اس کی مثالیں قرآن میں متعدد ہیں: حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت، اصحابِ کہف کا غار کی طرف رخ کرنا، صحابہ کی حبشہ کی طرف ہجرت اور بالآخر رسول اللہ ﷺ کی مدینہ کی طرف ہجرتِ عظمیٰ۔ ہجرتِ مکانی کی بھی فقہاء نے درجہ بندی کی ہے: کہیں یہ فرض ہوتی ہے جب دین پر عمل ناممکن ہو، کہیں مستحب ہوتی ہے جب مقصد علم، دعوت یا بہتر دینی ماحول کا حصول ہو، اور کہیں محض مباح نقل مکانی ہوتی ہے جسے ہجرت کے شرعی مفہوم سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ دوسری صورت ہجرتِ معنوی یا قلبی ہے، یعنی انسان برے ماحول اور بری صحبت کو چھوڑ دینا؛ حدیث میں ارشاد ہے کہ مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کی ہوئی چیزوں کو چھوڑ دے، اور ایک اور حدیث میں ہے کہ ہجرت یہ ہے کہ تم اپنے رب کی ناپسندیدہ چیز کو ترک کر دو۔ یہ ہجرت ہر زمانے اور ہر جگہ کے مسلمان کے لیے عام ہے اور اس کا دروازہ قیامت تک کھلا ہے۔

ہجرت کی تیسری صورت ہجرتِ عملی ہے جس سے مراد برے اعمال وعادات کو چھوڑ کر نیک اعمال اختیار کرنا ہے؛ شرک سے توحید کی طرف، بدعت سے سنت کی طرف، جہالت سے علم کی طرف اور غفلت سے بیداری کی طرف آنا اسی کا حصہ ہے۔ چوتھی صورت دعوتی و تعلیمی ہجرت ہے کہ مسلمان علمِ دین سیکھنے، دعوت و تبلیغ یا کسی دینی خدمت کے لیے سفر اختیار کرے؛ طلبِ علم کے سفر کو احادیث میں جنت کے راستے سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فقہاء نے دار کے اعتبار سے بھی ہجرت کی صورتیں بیان کی ہیں: دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت، دارِ فسق سے دارِ عدل کی طرف ہجرت اور ظلم و جبر کی سرزمین سے امن کی سرزمین کی طرف ہجرت۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ فتحِ مکہ کے بعد مکہ سے مدینہ کی مخصوص ہجرت کا حکم ختم ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ فتح کے بعد ہجرت نہیں رہی، البتہ جہاد و نیت باقی ہے؛ تاہم گناہ چھوڑنے والی معنوی ہجرت اور دین کی حفاظت کے لیے ناگزیر نقل مکانی کا اصول قیامت تک باقی ہے اور دنیا کے مختلف خطوں میں مظلوم مسلمان اسی اصول پر عمل کرتے رہے ہیں۔

ہجرت کی حکمتیں اور فوائد

ہجرت کی سب سے بڑی حکمت ایمان کی حفاظت ہے کہ انسان اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی دین کو بچانے کے لیے وطن، جائیداد اور رشتوں تک کی قربانی دے دیتا ہے۔ دوسری حکمت اسلامی معاشرے کی تشکیل ہے؛ مدینہ کی ہجرت نے منتشر مسلمانوں کو ایک منظم امت اور ریاست میں تبدیل کر دیا اور مہاجرین و انصار کی اخوت نے ایثار و قربانی کی لازوال مثال قائم کی۔ تیسری

حکمت یہ ہے کہ ہجرت انسان کو جمود سے نکال کر جدوجہد کی راہ پر ڈالتی ہے اور دعوتِ دین کو نئی سرزمینوں تک پہنچنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ چوتھی حکمت یہ ہے کہ آزمائش کے اس عمل سے مخلص اور منافق کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے، جیسا کہ زیرِ بحث آیات میں بھی یہی حقیقت اجاگر ہوئی ہے کہ محض زبانی دعویٰ کافی نہیں، عملی قربانی ہی ایمان کا ثبوت ہے۔ قرآن مجید نے ہجرت کرنے والوں کے لیے دنیا میں وسعت اور آخرت میں عظیم اجر کا وعدہ کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ النساء کی آیات 88 تا 91 نے ہجرت کو ایمانی وابستگی کی عملی کسوٹی قرار دیا، ہجرت سے انکار کر کے دشمن کے دار میں رہنے والوں سے ولاء و دوستی سے منع فرمایا، معاہدے کی پاسداری اور صلح جو فریقوں سے عدمِ تعرض کا حکم دیا اور دوغلے فتنہ پروں سے ہوشیاری کی تلقین کی۔ ہجرت کی صورتیں مکانی، معنوی، عملی اور دعوتی و تعلیمی ہیں اور ان سب کا محور ایک ہی ہے کہ مومن اپنے دین، ایمان اور ضمیر کی حفاظت کے لیے ہر قربانی کے لیے تیار رہے اور جہاں اس کا دین محفوظ نہ ہو وہاں بڑے رہنے کے بجائے اللہ کی وسیع زمین میں اس کے دین پر چلنے کی راہ اختیار کرے۔

سوال نمبر5: سورۃ النساء کی آیات 127 تا 130 میں یتیموں کے حقوق، عدل کے معیار اور ایثار کی حد کی وضاحت کیجیے۔ (20 نمبر)

سوال نمبر5: سورۃ النساء کی آیات 127 تا 130 میں یتیموں کے حقوق، عدل کے معیار اور ایثار کی حد کی وضاحت کیجیے۔

تعارف

سورۃ النساء کا آغاز ہی یتیموں اور عورتوں کے حقوق کے بیان سے ہوتا ہے اور اس سورت کے آخری حصے میں آیات 127 تا 130 میں ایک بار پھر انہی مظلوم طبقات کے حقوق، عدل کا بلند معیار اور میاں بیوی کے اختلاف میں ایثار و صلح کی حدود بیان کی گئی ہیں۔ آیت نمبر 127 میں لوگوں کے اس استفتاء کا جواب دیا گیا ہے جو وہ عورتوں، خصوصاً یتیم لڑکیوں کے بارے میں پوچھتے تھے جن کے ولی ان سے نکاح کرنا چاہتے مگر ان کا مقررہ مہر اور حق دینا نہیں چاہتے تھے، یا انہیں کسی اور سے شادی کرنے سے روک دیتے تھے۔ آیت نمبر 128 میں بیوی کی طرف سے شوہر کی بے رخی یا نشوز کا حل صلح اور ایثار کی صورت میں بتایا گیا ہے۔ آیت نمبر 129 میں ایک سے زائد بیویوں کے درمیان مکمل مساوات کی انسانی استطاعت سے باہر ہونے کی حقیقت بیان کر کے ظلم

کی انتہائی حد سے روکا گیا ہے، اور آیت نمبر 130 میں علیحدگی کی صورت میں اللہ کی کفایت کا وعدہ ہے۔ زیرِ نظر جواب میں ان تینوں موضوعات یعنی یتیموں کے حقوق، عدل کے معیار اور ایثار کی حد کو ترتیب وار بیان کیا جائے گا۔

یتیموں کے حقوق

آیت نمبر 127 میں ارشاد ہے کہ لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں فتویٰ پوچھتے ہیں؛ کہہ دیجیے کہ اللہ تمہیں ان کے بارے میں فتویٰ دیتا ہے اور وہ احکام بھی جو کتاب میں تمہیں پڑھ کر سنائے جاتے ہیں ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں جنہیں تم ان کا مقررہ حق نہیں دیتے اور ان سے نکاح کی رغبت رکھتے ہو، اور کمزور بچوں کے بارے میں بھی، اور یہ کہ تم یتیموں کے ساتھ پورے انصاف پر قائم رہو؛ اور جو نیکی تم کرو گے اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یہ آیت دراصل اسی سورت کی ابتدائی آیات، خصوصاً آیت نمبر 2، 3 اور 6، کی طرف اشارہ کرتی ہے جن میں یتیموں کا مال ان کے حوالے کرنے، ناجائز طور پر ان کا مال کھانے کو آگ کھانے سے تشبیہ دینے، اور یتیم لڑکیوں سے انصاف نہ کر سکنے کی صورت میں دوسری عورتوں سے نکاح کرنے کے احکام بیان ہو چکے ہیں۔ ان آیات کا مجموعی پیغام یہ ہے کہ یتیم لڑکی کا مہر پورا دیا جائے، اس کی میراث میں سے اس کا حق نہ دبایا جائے، اسے نکاح سے روک کر اس کا کافی مہر پر مجبور کر کے اس کے مال پر قبضے کی کوشش نہ کی جائے اور بچوں کو بالغ ہونے پر ان کا مال گواہوں کی موجودگی میں دیانت سے سپرد کیا جائے۔

نبی اکرم ﷺ کی احادیث نے یتیموں کے حقوق کو مزید اجاگر کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ساتھ ہوں گے اور درمیانی شہادت کی انگلی سے اشارہ فرمایا۔ دوسری طرف یتیم کا مال ناحق کھانے کو سات ہلاک کرنے والے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یتیم کے حقوق محض مالی نہیں بلکہ اس کی پرورش، تعلیم، شفقت اور عزتِ نفس کا تحفظ بھی ان میں شامل ہے۔ اسلامی ریاست اور معاشرہ دونوں اس کے ذمہ دار ہیں کہ یتیم بے سہارا نہ رہے۔ آیت کے آخر میں یہ فرمانا کہ جو نیکی تم کرو گے اللہ اس کو جانتا ہے، اس بات کی ترغیب ہے کہ یتیموں کے ساتھ حسنِ سلوک محض قانونی پابندی نہیں بلکہ اللہ کی رضا اور اجرِ عظیم کا ذریعہ سمجھ کر کیا جائے، اور اسی جذبے سے کمزوروں کی خدمت ایک عبادت بن جاتی ہے۔

عدل کا معیار

ان آیات میں عدل کا جو معیار پیش کیا گیا ہے وہ نہایت بلند اور ہمہ گیر ہے۔ آیت نمبر 127 میں "ان تقوموا للیتٰمی بالقسط" کہہ کر حکم دیا گیا کہ یتیموں کے معاملے میں قسط یعنی کامل انصاف پر ڈٹے رہو؛ قسط سے مراد وہ انصاف ہے جس میں نہ کمی ہو نہ زیادتی اور ہر حق دار کو اس کا پورا حق ملے۔ اسی سورت کی آیت نمبر 135 میں اس معیار کو اپنے عروج پر پہنچایا گیا ہے کہ انصاف پر قائم رہو خواہ گواہی خود تمہارے، تمہارے والدین یا قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ آیت نمبر 129 نے عدل کے معیار کی ایک اور جہت واضح کی کہ ایک سے زائد بیویوں کے درمیان دلی میلان اور قلبی محبت میں کامل مساوات انسان کے بس سے باہر ہے، یہ [illegible] کا جزو اختیاری شے نہیں؛ تاہم شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ ظاہری حقوق یعنی نفقہ، رہائش، وقت کی تقسیم اور سلوک میں عدل کیا جائے اور ایک کی طرف اس طرح نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو لٹکی ہوئی معلقہ (چھوڑ دو۔ اس سے شریعت کا مزاج معلوم ہوتا ہے کہ وہ انسان سے اسی چیز کا مطالبہ کرتی ہے جو اس کے اختیار میں ہو اور غیر اختیاری امور میں اسے مکلف نہیں ٹھہراتی، لیکن اختیار کے دائرے میں ناانصافی کی کوئی گنجائش نہیں رکھتی۔

عدل کے اس معیار کا عملی اطلاق زندگی کے ہر شعبے میں ہوتا ہے: گھر میں اولاد کے درمیان عدل، چاہے وہ تحفہ دینا ہو یا شفقت کا اظہار؛ تجارت میں ناپ تول اور معاہدے کی پابندی میں عدل؛ عدلیہ میں گواہی اور فیصلے میں عدل؛ اور حکمران کے ہاں رعایا کے درمیان عدل۔ قرآن نے عدل کو تقویٰ سے قریب ترین قرار دیا ہے اور ظلم کو اندھیروں سے تعبیر کیا ہے۔ یتیموں اور عورتوں جیسے کمزور طبقات کے ضمن میں عدل کا یہی بلند معیار اس بات کی ضمانت ہے کہ طاقت ور اپنے مفاد کے لیے شریعت کو ڈھال نہ بنا سکے؛ ولی یتیم لڑکی سے انصاف نہ کر سکے تو اس سے نکاح ہی نہ کرے، اور شوہر بیویوں میں ظاہری عدل نہ کر سکے تو ایک ہی پر اکتفا کرے۔ یوں عدل محض ایک قانونی اصطلاح نہیں بلکہ پورے نظامِ حقوق کی روح ٹھہرتا ہے۔

ایثار کی حد

آیت نمبر 128 میں ایثار اور صلح کی فضیلت و حدود بیان کی گئی ہیں کہ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر کی بے رخی یا اعراض کا اندیشہ ہو تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں کہ آپس میں صلح کر لیں، اور صلح بہتر ہے، اور نفوس میں حرص موجود رکھی گئی ہے؛ اور اگر تم احسان کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو اللہ تمہارے اعمال سے خوب باخبر ہے۔ اس آیت کے پس منظر میں حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ مشہور ہے جنہوں نے اپنی باری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دے کر نبی اکرم ﷺ کے نکاح میں رہنے کو ترجیح دی تھی، اور اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی کے معاملے کی روایات بھی ملتی ہیں۔ یہاں ایثار سے مراد یہ ہے کہ فریق اپنے کسی حق سے رضاکارانہ طور پر دست بردار ہو کر رشتہ برقرار رکھے، مثلاً بیوی اپنے مہر کا کچھ حصہ یا اپنی باری کا حق چھوڑ

دے تا کہ گھر ٹوٹنے سے بچ جائے۔ اس ایثار کی پہلی حد یہ ہے کہ یہ مکمل رضامندی سے ہو، کسی دباؤ، خوف یا مجبوری سے لیا گیا ایثار دراصل ایثار نہیں ظلم ہے، اور آیت نمبر 19 میں اسی ظلم کی ممانعت گزر چکی ہے۔

ایثار کی دوسری حد یہ ہے کہ اس کا تعلق قابلِ معافی مالی و وقتی حقوق سے ہے؛ جو فرائض اللہ نے لازم کیے ہیں، مثلاً نماز، اولاد کے بنیادی حقوق یا دوسروں کے حقوق، ان میں ایثار کے نام پر کوتاہی جائز نہیں۔ تیسری حد یہ ہے کہ ایثار یک طرفہ بوجھ نہ بن جائے۔ آیت نے شوہر کو بھی احسان اور تقویٰ کی تلقین کی ہے کہ اگر بیوی اپنے حق سے دست بردار ہو رہی ہے تو شوہر اسے احسان سے قبول کرے، مزید مطالبات کا لالچ نہ کرے اور تقویٰ کو پیشِ نظر رکھے، کیونکہ نفس کی حرص فریقین کو صلح کے بعد بھی کھینچ تانی کی طرف لے جا سکتی ہے۔ اسی توازن سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام صلح و ایثار کو طلاق پر ترجیح تو دیتا ہے مگر کسی کمزور فریق کی قربانی کو مستقل اصول بنانے کے بجائے اسے عارضی اور باہمی رضامندی کا حل قرار دیتا ہے؛ اور جب صلح ممکن نہ رہے تو آیت نمبر 130 میں علیحدگی کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے دونوں کو بے نیاز کرنے کا وعدہ فرمایا ہے، تاکہ کوئی فریق خوفِ فقر کی وجہ سے ظلم برداشت کرنے پر مجبور نہ ہو۔ یوں ایثار کی حد شریعت نے خود مقرر کر دی ہے کہ یہ رضامندی، احسان اور تقویٰ کے دائرے میں ہو اور ظلم کا ذریعہ نہ بنے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ آیات 127 تا 130 میں یتیم لڑکیوں کے مہر و میراث کے حقوق کی حفاظت، یتیموں کے ساتھ کامل قسط و انصاف کا حکم، ظاہری حقوق میں عدل کو لازم اور قلبی میلان میں انسانی حد کی رعایت، اور اختلافِ زوجین میں رضامندانہ صلح و ایثار کو ترجیح دیتے ہوئے اس کی حدود مقرر کی گئی ہیں۔ ان احکامات کا مجموعی مقصد ایک ایسے معاشرے کی تعمیر ہے جس میں کمزور کا حق محفوظ ہو، طاقت ور عدل کا پابند ہو اور گھر کا مسئلہ جنگ و جدل کے بجائے ایثار، احسان اور تقویٰ سے حل ہو۔ یہی وہ تربیت ہے جو سورۃ النساء کو حقوقِ انسانی کا ایک مکمل منشور بنا دیتی ہے۔